ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.3,Issue No.3(2021)
(July to September)

اکیسویں صدی میں ناول نگاری

Novel writing in the 21st centure

خدیجہ شاہد

لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج فار وویمن، صغیر شہید پارک نوشہرہ روڈ، گوجرانوالہ

Abstract:

By the 21st century ,the novel has taken many turns in many directions ,achieving many milestones in terms of theme ,style ,technique and characterization .I find the main subject of man's inner conflict ,his identity ,the problems facing man and his situation in very clear words .In the present age ,every one is busy in their life .There is chaos and noise everywhere.Every human being is running for his share and his search for identity as he completes his cycle.In the 21st centure ,where new themes have been explored ,there is also a sense of being connected to one's own tradition.While personal conflicts were highlighted ,political and social conditions and events were also mapped out . Human behavious, indifference towards moral values, materialism, ignorance prevelent in rural life, reflection conflict, sexual lust, illusion, political and economic issue, individual loneliness and description of that loneliness, the depiction of social trends: all thes themes are narrated with the modern innovation techniques. On the one hand man is connected to the whole world and the world is being transformed into a global village, on the other hand, he is suffering from loneliness and inner anguish and man is unable to understand his own essence. These bitter realities of society have been described in the novel of the 21st centure.

Key Words: 21st century, milestones, characterization, human being, tradition, highlighted, reflection conflict, realities

ادب میں فکشن پر اگر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فکشن انسانی زندگی کا عکس، روزمرہ زندگی کا بیان، گزری ہوئی زندگی کی باز آفرینی ماضی اور حال کا آئینہ ہے۔ فکشن میں بالخصوص ناول کا زندگی سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ ناول زندگی کا ترجمان، حقیقی زندگی کا بیان، تاریخی واقعات کا عکاس، معاصر زندگی کی سچائیوں کا علمبردار، معاشرے کی صداقتوں پر مبنی ایک صنف ادب ہے۔ زندگی کے سارے رنگ، نازک خیالیاں اس صنف ادب میں سمٹ آتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس کوئی اور افسانوی صنف ادب ان تمام جزئیات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ناول کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس صدی تک آتے آتے ناول نے کئی سمتیں، کئی موڑ تبدیل کیے۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ کو اپنے اندر سمویا ہے ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد "مراۃ العروس" 1869 سے اگر ہوتا ہے تو ناول کی عمر تقریباً ڈیڑھ سو سال بنتی ہے۔ جس میں ناول نے موضوع، ہیت، اسلوب، تکنیک اور کردار نگاری کے حوالے سے کئی سنگ میل عبور کر لیے ہیں ڈپٹی نذیر احمد نے نہ صرف متوسط طبقہ کی زندگی اور کشمکش کی فضاء کو پیش کیا بلکہ ان کے

مسائل کو سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنے سمجھنے تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اُس عہد کے لکھنے والوں کی تحریروں میں ڈپٹی نذیر احمد کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جو روایت قائم کی تھی وہ راشد الخیری پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔

انسان مختلف زاویوں سے ماضی کے دریچوں میں جھانکتا ہے کبھی وہ اپنی تباہوں اور بربادیوں کے لیے ماضی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے کبھی اسے ماضی اس قدر حسین نظر آتا ہے کہ وہ حال کو فراموش کر کے اپنی ناکامیوں محرومیوں کا علاج ماضی میں تلاش کرنے لگتا ہے تو کبھی حال کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ماضی کو کریدتا ہے۔ ناول نگار بھی ماضی میں جھانک کر قدیم تاریخ کو معاشرتی حوالوں سے ناول کے کینوس میں سموتا ہے۔ انسان تبدیلی کا خواہاں ہے۔ ایک ہی ڈگر پر چلنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ ایک ہی رو میں بہہ جانے سے، ایک ہی ماحول میں رہنے سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ جہاں زندگی کی باقی چیزوں میں تنوع پسند ہے وہیں فنون لطیفہ میں وسیع سوچ اور تغیر کو پسند کرتا ہے الگ اور انوکھے انداز کا طالب ہے۔ ناول کے فن میں ایسی ہی تبدیلی مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" سے آئی۔ نئے موضوع کے لحاظ سے مرزا ہادی رسوا کی تخلیقی کاوش نہایت اہم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ آج بھی اس موضوع پر نئے انداز سے قلم اٹھایا جاتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے اپنے نکھرے ہوئے اسلوب کے ساتھ حقیقت کو جس طرح پیش کیا ہے اُسے آج بھی قابل ذکر ناولوں میں جگہ دی جاتی ہے۔

اُردو ادب میں ناول کا جو سفر اصلاحی ناول سے شروع ہوتا ہے وہ مزاح ظرافت، رومانیت، تاریخیت، نفسیات علامت سے ہوتا ہوا بیسویں صدی میں قدم رکھتا ہے۔ تو بیسویں صدی اخلاقیات، فلسفیانہ فکر، علامتی کردار، نفسیاتی زاویہ، وجودی رویہ، حقیقت پسندانہ روش اختیار کرتا ہے اور زندگی کے داخلی اور خارجی عمل کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں لکھنے والوں کا ایک خاص موضوع تقسیم ہند کے واقعات، تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل اور فسادات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں قراۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" جدت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ جدت اسلوب، تکنیک اور موضوعات ہر حوالے سے اہم ہے۔ اس ناول نے اردو ناول کو نئے اُفق سے روشناس کرایا۔ بیسویں صدی میں ناول کی نئی جہتیں نئی راہیں تلاش کی گئیں۔ ان میں نمایاں نام پریم چند، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی، راجندر سنگھ بیدی، محمد احسن فاروقی، فضلی احمد کریم فضلی، شوکت صدیقی، انور سجاد، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، فرخندہ لودھی، الطاف فاطمہ، نثار عزیز بٹ، بانو قدسیہ، انیس ناگی، قدرت اللہ شہاب، ستنفر حسین تارڑ، جیلانی بانو، جوگندر پال، جنہوں نے اکیسویں صدی کے فکشن کو براہ راست متاثر کیا اور نئے لکھنے والوں کے لیے رہ ہموار کی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ناول میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہی رجحان اکیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی میں ناول نگاری کے فن میں جہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں روایت کو بھی آگے بڑھایا گیا۔ اس صدی میں ہیت اور تکنیک کی تبدیلیوں کے ساتھ موضوعات میں جدت نظر آتی ہے۔ اس صدی میں منظر عام پر آنیوالے ناول متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں اہم موضوع انسان کی ذہنی، نفسیاتی اور اخلاقی کشمکش، اپنی شناخت انسان کو درپیش مسائل اور صورت حال کا اظہار بڑے واشگاف الفاظ میں ملتا ہے۔ مذکورہ حوالوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں جو ناول منظر عام پر آئے ان کا ذکر موضوع اور اسلوب کے حوالے ناگزیر ہے۔

اس صدی میں ایک اہم نام مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قربت مرگ میں محبت" پہلی بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۸ میں کچھ تبدیلیوں کے بعد سنگ میل سے دوبارہ شائع ہوا۔ اس ناول میں مسلسل آگے بڑھنے کا فلسفہ ہے۔ پانی جیسے ٹھہرتا نہیں اس طرح زندگی بھی رکتی نہیں۔ انسان ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ کی طرف سفر کرتا ہے۔ ناول میں ادھیڑ عمر شخص خاور بھی زندگی کے نشیب و فراز کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ "قربت مرگ میں محبت" ایک عمر رسیدہ قلم کار خاور کی کہانی ہے۔ اس کی بیوی کو مرے ہوئے کافی وقت گزر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں تین

ادھیڑ عمر خواتین داخل ہوتی ہیں۔ پہلی خاتون غلافی آنکھوں والی ہے جو کچھ عرصہ خاور کی زندگی میں رہتی ہے۔ دوسری عورت عابدہ جو خطرناک بیماری میں مبتلا ہے اور جلد ہی مرنے والی ہے۔ خاور اس خاتون سے ہونے والی ملاقات اور گفتگو کا احوال غلافی آنکھوں والی کو سناتا رہتا ہے۔ تیسری خاتون ڈاکٹر سلطانہ جس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ امریکہ گزارا ہے اور سری لنکا سے واپسی پر ائیر پورٹ پر خاور کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن دریائے سندھ کے سفر کے دوران خاور کی موت ہو

جاتی ہے۔ ناول موت کے پراسرار سائے میں چلنے والی محبت کی داستان ہے اس کے ساتھ خاور جیسے ہوس سے آزاد شخص کا عورت کی جانب سے محبت کی خواہش رکھنے کی کہانی ہے ناول میں انسانی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان نئے ماحول کو اپنالیتا ہے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کو اس ناول میں مربوط کیا گیا ہے۔ "قربت مرگ میں محبت" مجموعی طور پر موت کے منظر نامے پر لکھا گیا ناول ہے۔ ناول کے آغاز سے اختتام تک محبت مرگ کی قربت میں گہرے سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عظمی طارق اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

> اس ناول میں موت کی آہٹ ہے اس میں جذبوں کی موت، وعدوں کی، ارادوں کی موت اور سب سے بڑھ کر جیتے جاگتے زندہ لہو سے گرمائے ہوئے بدنوں کی موت نظر آتی ہے۔(۱)

ہر فن پارہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب اپنے انداز بیان سے ناول میں تاریخ کو سمٹنے کی کوشش ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی اپنے ناول "قلعہ جنگی" میں افغان جنگ کا پس منظر، مجاہدین کے حالات اور خوفناک ماحول کی منظر کشی مختلف زاویوں سے کی ہے۔ ادب اور زندگی کے تعلق کو اس طرح ایک قلعہ کے حصار میں سمو دیا ہے کہ بامعنی فن پارہ وجود میں آگیا ہے۔ ناول جیسا کہ نام "قلعہ جنگی" سے عیاں ہوتا ہے کہ کسی قلعہ کے بارے میں ہے۔ اس کی کہانی قلعہ جنگی جو افغانستان میں مرزا شریف سے کچھ فاصلے پر ہے۔ قلعہ کے تہہ خانے میں کچھ مجاہدین چھپے ہیں جو شدید زخمی اور بھوکے ہیں ان کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔ یہ جہاد کی غرض سے افغانستان آئے ہیں۔ ناول مجاہدین کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ جس کے کردار قید میں اپنی موت کے انتظار میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ انیس ناگی مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "اس مختصر سے ناول میں سارا بیان ایک گھوڑے کا ہے جو قلعہ جنگی میں بار بار بلاوجہ سیڑھیاں چڑھتا اور اترتا ہے۔ پس منظر میں ان جہادیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو پاکستان اور دوسرے ممالک سے افغان جہاد میں حصہ لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس ناول کی ساری تفصیلات بھی قیاسی ہیں۔"(۲)

"ڈاکیا اور جولاہا" مستنصر حسین تارڑ کا اکیسویں صدی میں شائع ہونا والا تیسرا ناول جو ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ "قربت مرگ میں محبت" کا مرکزی کردار خاور بھی "ڈاکیا اور جولاہا" کی رودین کی طرح ایک شادی شدہ اور ادھیڑ عورت کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ موضوع کی یکسانیت کے باوجود اس ناول کا اسلوب مستنصر حسین تارڑ کے سابقہ ناولوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں کہانی کو علامتی اور فلسفیانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں دیہاتی زندگی کی مرقع کشی کی گئی ہیں۔ مختلف قوموں، برداریوں کے اختلافات، زندگی کی ناہمواریاں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ناول میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں کے لوگوں کی سادگی اور عورتوں کی ضعیف الاعتقادی، بے وقوفی کے واقعات ناول میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا ۲۰۱۰ء میں آنے والا ناول "خس و خاشاک زمانے" کا موضوع وقت اور انسان ہے۔ وہ انسان جو زندگی گزارنے کے لیے زمانے کے جبر کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ وقت اور انسان کے علاوہ روحانی، سیاسی، معاشی، معاشرتی مشرقی پاکستان میں ہونے والی ناانصافیاں ناول کے

موضوعات میں شامل ہیں۔ ماضی اور حال کے واقعات کو ناول میں سمویا گیا ہے۔ قدیم برداریوں اور انسانوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ناول کا کردار امیر بخش جو والدین کی محبت، شفقت میں پروان چڑھا اور میٹرک کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں دھکے کھاتا ہے۔ تو زندگی اس پر اپنے سارے راز اور اسباق کھولتی ہے۔ بہت مشکلات اور مصائب برداشت کرتے ہوئے امیر بخش لاہور پہنچتا ہے اور یہاں پہنچے کے بعد کسی بھی کام کو حقیر نہیں سمجھتا۔ تقسیم کے بعد جب لوگ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آتے ہیں تو ان کی خدمت کرتا ہے۔ یہ کردار ناول "خس و خاشاک زمانے" میں باقی کرداروں کی نسبت سیدھا سادھا ہے۔ زندگی کی عام کوتاہیوں اور عیبوں سے پاک ہے جو اس کردار کی خوبی ہے۔ لیکن ناول میں یہ کہیں کہیں اُس کی خامی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس ناول میں سروسانسی کا کردار زندہ ہے۔ جو روزمرہ زندگی اور بنیادی انسانی رویوں کے قریب ہے۔ سروسانسی ایک کسان کا بیٹا ہے جو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسانوں کی بنیادی جبلت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اسی طرح اس ناول کا نسوانی کردار شاہت کا ہے جو اپنی اصل سے دور مغربی معاشرے میں پلی بڑی ہے۔ جب سروسانسی کی پوتی شاہت پاکستان آتی ہے تو یہاں آ کر وہ اپنی پہنچان کو تلاش کرتی ہے۔ مصنف نے ان دونوں کرداروں کی ملاقات سے دادا اور پوتی کا پیار اور صدیوں کا والہانہ پن دیکھایا ہے۔ ناول فلیش بیک تکنیک کے ذریعے ایک سے زیادہ نسلوں کو زمانی اعتبار سے بیان کرتا ہے۔ جو اردو ناول کی روایت میں نیا تجربہ نہیں اس سے پہلے قراۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین یہ تکنیک آزما چکے ہیں۔ تکینک کے حوالے سے ناول کی بڑی خوبی رنگارنگ متنوع ہے۔ قیام پاکستان ہندو سکھوں کے تعلقات، فسادات، (صدر ایوب خاں، یحیٰی خاں، ضیاالحق، پرویز مشرف کا دور حکومت جہاں سیاسی حوالہ وہاں کرداروں کے ذریعے رہن سہن طرز حیات انسان کی نفسیات موت اور جنس جیسے موضوعات کے نئے انداز سے ناول میں جدت کا عنصر ابھارتا ہے۔

سیاسی و سماجی صورت حال ادیب کو جھنجوڑتی ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے مصنف کے مشاہدے میں ماحول، سیاسی حوالے، سماجی صورت حال، طبقاتی کشمکش، زندگی کے نشیب و فراز اور بہت سے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ جن کو وہ اپنی تحریروں کی نظر کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول "اے غزال شب" میں بھی استحصالی نظام، معاشرتی اور معاشی شکست وریخت، ملاؤں کا منافقانہ رویہ اور معاصر سیاسی حالات کو علامتی انداز میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں یکے بعد دیگر ان کے ناول آنے سے ان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے "قلعہ جنگی" میں بھی سیاسی صورت حال پر کی گئی تنقید اور طنز کے نشتر چلائے گئے ہیں۔ "اے غزال شب" ناول میں مارکسی، اشتراکی، انقلابی نظریات رکھنے والے کردار نظر آتے ہیں لیکن اس نظریے کا نعرہ ان کے لیے مشکلات لے کر آتا ہے۔ ایک نظریے کے ختم ہونے سے بہت سے نئے نظریات جنم لیتے ہیں لیکن اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور خود کو تبدیل کر لیتے ہیں وہی کامیاب رہتے ہیں انہیں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "اے غزال شب" ایک فکری ناول ہے اس کے کردار اشتراکی کی فلسفے سے قریب تر ہیں جب پاکستان میں سیاسی سطح پر اس نظریے کو پذیرائی مل رہی تھی تو پاکستان کا حکمران اس جماعت کے نعرہ سے خوف زدہ تھا تب ناول میں ظہیر الدین انقلاب کے خواب دیکھتا ہے کہ لوگ اس کا بھرپور استقبال کرتے ہیں اور وہ معاشرے میں عزت کا مقام پاتا ہے۔ تب ہی ایک ایسا طبقہ اٹھتا ہے جو اشتراکیت کو ایک گمراہی سمجھتا ہے۔

گہری نظریات دلچسپی کے بعد بھی ظہیر الدین تنگ دستی کا شکار رہتا ہے اور روس میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر لینن کے مجسموں کو توڑ دیتا ہے۔ اپنی مجبوری کے تحت اپنے آبائی وطن واپس آ جاتا ہے جہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوتی ہیں۔ معاشی تنگ دستی کے باوجود بھی ظہیر الدین کی نظریاتی وابستگی کم نہیں ہوتی۔ عارف نقوی بھی لینن کے نظریات کا پرچار کرتا ہے اور اپنی غربت کو دور کرنے کے خواب دیکھتا ہے لیکن یہ خواب بکھر جاتے ہیں جس سے پریشان رہنے لگتا ہے۔ یہ کردار اکیسویں صدی کے بہت سے کرداروں کی طرح تنہائی کا شکار ہیں اپنی بیوی کو جلانے کے بعد اس میں سے کچھ راکھ محفوظ کر لیتا ہے جو اسے جذباتی سہارا دیتی ہے۔ ناول میں جہاں عارف نقوی اور ظہیر الدین وطن کے لیے محبت اور کشش محسوس کرتے ہیں اور مستقل

پاکستان میں رہائش اختیار کرتے ہیں وہیں ناول کا تیسرا کردار مصطفےٰ اسلام اپنی بیٹی کو ملنے لاہور آتا ہے جب کہ اس کی بیٹی اُسے سرپرائز دینے کے لیے ہنگری واپس لوٹ جاتی ہے اور بیٹی کا خط ملتے مصطفےٰ اسلام بھی واپس چلا جاتا ہے یہاں وطن کی محبت کا نظریہ دم توڑتا دیکھائی دیتا ہے۔ چوتھا کردار بھی ترقی پسند انقلابی شاعر کے بیٹے سردار قالب کا ہے یہ کردار بھی غربت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے اور ایک جنرل کی بیوہ بیٹی سے شادی کر لیتا ہے۔ برسوں بعد سردار قالب اپنی بیٹی کے ساتھ وطن لوٹتا ہے تو اس کی بیٹی اس سے پوچھتی ہے کہ وہ اتنی شاندار وراثت کو کیوں چھوڑ کر گیا تھا جس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ وراثت کتنی ہی پر شکوہ کیوں نہ ہو فٹ پاتھ پر پڑے گداگر کا پیٹ نہیں بھر سکتی جس سے اس کی نظریاتی وابستگی کم دیکھائی دیتی ہے۔ مصنف نے ناول میں ایک عام انسان کی حیثیت سے معاشرے کو جلی کٹی سنائی ہیں فقروں میں شدید طنز ہونے کے باوجود وہ ایک رائے ہی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور کی عوام ذہنیت اور جنسی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کا کردار جینا بھی مستنصر حسین تارڑ کے ناول "خس و خاشاک زمانے" کی شباہت کی طرح اپنی جڑوں کی تلاش کرتی نظر آتی ہے۔

غفور احمد اپنی کتاب "نئی صدی نئے ناول" میں "اے غزال شب" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "ناول موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں اعتبار سے کوئی جدت نہیں رکھتا، ماسوائے بات کو پھیلا دینے کے، بہت ساری باتیں ایسی ہیں جنہیں مصنف بار بار دہرا رہا ہے۔ پانیوں کے بہاؤ اور روانی کا تذکرہ، اُن کے سوکھ جانے کا غم، بندہ مزدوروں کی تلخی ایام، مذہب کے نام پر استحصال، زمانے کے خس و خاشاک ہو جانے کا المیہ، خانہ بدوشوں، چنگڑوں اور سانسیوں کی زندگی کے شب و روز، سویت یونین کے زوال کے بعد جنس انسانی کی ارزانی، سانپوں کا ذکر، ماورائے فکشن عناصر اور ڈھیر ساری پرانی علامتوں کا دوہرایا جانا اس کے علاوہ ہے" (۳)

شمس الرحمن فاروقی کا ناول "کئی چاند تھے سر آسمان" اپنی نوعیت کا منفرد ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا۔ ناقدین کی آرا میں یہ ناول قرۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" اور عبداللہ حسین کے "اُداس نسلیں" کی یہ درمیانی کڑی ہے۔ فاروقی صاحب نے اس ناول میں ہند اسلامی تہذیب اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی اردو زبان، داغ دہلوی کا پس منظر سرگزشت وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کی زندگی کے حالات و واقعات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ وزیر خانم کی زندگی غم، تکلیفات، مشکلات میں گزری، جسے ناقدین نے THE GREAT TRAGDY OF WAZEER BEGUM سے تعبیر کیا ہے۔ ناول میں اس المیے کے ساتھ ساتھ، شرفاء کا طرز تخاطب، رہن سہن، شعر و سخن سے عوام، خواص کی رغبت کے ساتھ انگریزوں کا مقامی لوگوں سے رویہ مارسٹن بلیک کا مقامی خاتون وزیر خانم کو پسند کرنے کے باوجود برابر کی سطح پر نہ اپنا سکنا ہر رویہ اس کی ذات میں موجود فرنگی پن کو ظاہر کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ناول اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر طرح کی چاشنی موجود ہے۔ موضوع، زبان، تکنیک ہر لحاظ سے ایک نیا منفرد اور انوکھا تجربہ ہے۔ اس ناول کی اہم خوبی یہ ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے اس ناول کو اسی عہد کی زبان میں لکھا جس عہد کے کرداروں کو بیان کیا۔

غفور احمد "کئی چاند تھے سر آسمان" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی اردو زبان اپنے تمام تر جوبن کے ساتھ زندہ ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کہیں کہیں الفاظ ثقیل اور بوجھل ہو گئے۔ مگر یہ محض اس لیے ہے کہ درمیان میں دو صدیوں کی خلیج حائل ہے۔ زبان و بیان

کے لہجے ہر آنے والے دور کیساتھ کچھ نہ کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اپنی اس ثقافت اور قدیم اُردو زبان کے استعمال کے باوجود یہ ایسا شاہکار ہے جو ایک لمبے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ (۴)

مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" انوکھی تکنیک، اسلوب کے ساتھ ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں آ گیا۔ انسان روز ازل سے ہی آزادی کی خواہش کرتا رہا ہے۔ انسان میں آزادی اور غلامی کی جو کشاکش ہے وہ یہاں "غلام باغ" میں وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ آزادی کی خواہش معاشرے میں مثبت چیز ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ غلبہ کے حصول کی کوشش ہے۔ ہر شخص دوسرے کو مغلوب کرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے اور اس کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز کام بھی کرتا ہے۔ اس بنیادی خواہش کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ ناول کے تمام کردار دوسرے پر غلبہ چاہتے ہیں۔ یاور عطائی خود کو منوانے کے لیے انعام گڑھ سے شہر آ کر بس جاتا ہے۔ وہاں کے ارباب بست و کشاد کا علاج کرتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ یارو عطائی سے اپنی مردانہ قوت میں اضافے کے لیے آتے ہیں اس نے بڑے بڑے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ یارو عطائی اپنے گھر میں پارٹی دیتا ہے۔ اس کا دوست امبر جان یارو عطائی کے گھر میں ہونے والی پارٹی میں اس کی بیٹی زہرہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یاور عطائی اس منظر کو برداشت نہیں کر پاتا اور اُس کی موت ہو جاتی ہے۔ زہرہ کی ماں اور بھائی الگ گھر میں رہتے ہیں اس کی ماں کا کہنا ہے کہ یاور عطائی نے اس سے جھوٹ بول کر اپنی حیثیت کو چھپا کر اُس سے شادی کی تھی۔ اپنی ماں کے برعکس زہرہ اپنے والد کی اصل حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتی ہے۔ زہرہ کے کردار میں اپنے باپ کی طرح تجسس پایا جاتا ہے۔ جو اسے اصل تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں انعام گڑھ لے آتا ہے۔ کبیر مہدی اپنی عجیب و غریب باتوں سے لوگوں کو چونکا دیتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو نفسیاتی دباؤ میں رکھنا ہے جو اپنی تحقیق و تصنیف سے اپنے قلم کے ذریعے خود کو تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ ہاف مین اپنی تحقیق و جستجو کو لے کر جنون کی حد تک جاتا ہے۔

ناول "غلام باغ" کے تمام کردار نامعلوم کی کھوج، تجسس اور خود کو منوانے کی چاہ میں جنون پاگل پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اپنی ذات کی محرومیوں انسان کی بے بسی خالی پن انسانی زندگی اور اس سے ملحق رویوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اپنے موضوع، اسلوب، ہیت اور کردار نگاری سبھی حوالوں سے ایک منفرد ناول ہے۔ اُردو کے افسانوی ادب میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ ہے۔

مرزا اطہر بیگ کا دوسرا ناول "صفر سے ایک تک" ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول سائبر اسپیس کے ایک منشی کی سرگزشت ہے۔ جس کو اطہر بیگ نے اپنے جدید اور انوکھے رنگ میں پیش کیا ہے۔ ناول میں جاگیر داری نظام کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کیا ہے اور ناول میں ان موجودہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو جدتوں کی بنا پر معاشرے میں فروغ پا رہے ہیں۔ ایک طرف انسان پوری دنیا سے جڑا ہوا ہے اور دنیا سمٹ کر آفاقی گاؤں میں تبدیل ہو گئی تو دوسری طرف تنہائی اور داخلی کرب کا شکار ہے اور انسان اپنی ہی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہوتا جا رہا ہے۔ معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرتے وقت بنیادی طور پر اس معاشرتی نظام کو پیش نظر رکھا ہے۔ ناول میں ایک ایسا خاندان دیکھا گیا ہے جو صدیوں سے کوتل سالاروں کا منشی ہے۔ لیکن ناول کا مرکزی کردار ذکاء اللہ عرف ذکی، ذکو اور اس کا بڑا بھائی ثناء اللہ بچپن سے ہی سوچتے ہیں کہ وہ سالاروں کے منشی نہیں بنیں گے۔ منشی گیری کا ریکارڈ ذکاء اللہ کے والد منشی عطاءاللہ کے پاس محفوظ تھا۔ جیسے ذکاء اللہ کمپیوٹر میں محفوظ کرتا ہے تاکہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کر سکے۔ حیات محمد سالار کے بیٹے فیضان سالار اور ذکاء اللہ ایک ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہیں۔ لیکن پیسوں کی کمی کی وجہ سے ذکاء اللہ میڈیکل میں نہ جا سکا۔ اس کا بھائی اسے کمپیوٹر ٹیکنکل کورس کرنے کے لیے فیضان کے ساتھ لاہور بھیجتا ہے ذکاء اللہ سوچتا ہے کہ فیضان کی منشی گیری نہیں کرے گا۔ لیکن آغاز سفر سے یہی وہ منشی گیری پر تعینات ہو جاتا ہے۔ لاہور پہنچے کے بعد فیضان سالار ذکی کو اپنے ساتھ اپنے بنگلے پر لے آتا ہے۔ ایک شام فیضان سالار کو سالاروں کی پارٹی میں فرانسیسی خاتون سے محبت ہو

جاتی ہے۔ اُس سے بات کرنے کے لیے سالار ذکاء اللہ کو بھیجتا ہے وہاں بھی ذکاء اللہ طنز آمیز فقروں کا نشانہ بنتا ہے۔ "صفر سے ایک تک" ناول کو پڑھتے ہوئے "غلام باغ" کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ "غلام باغ" کا کردار کبیر مہدی اور "صفر سے ایک تک" کا کردار ذکاء اللہ دونوں کی ذہنیت ایک جیسی دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کا بنیادی مقصد دوسروں پر غلبہ پانا ہے دونوں اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ مقصد کے علاوہ ان دونوں کرداروں کی عادات بھی ملتی جلتی ہیں۔ کسی بھی بات کے رد عمل میں دونوں "گھسیٹاکاری" (لکھنا) شروع کر دیتے ہیں۔

منشی ذکی کمپیوٹر پروگرامنگ کے ذریعے غالب آنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے تحقیق و جستجو کرتا رہتا ہے۔ اور نئے نئے پروگرام بناتا ہے۔ سالار خاندان جو صدیوں سے اُن پر غالب ہے۔ لیکن نئی نسل میں ذکا اللہ اُن پر غالب آنا چاہتا ہے اور اس کے لیے ناول میں جگہ جگہ کہتا ہے۔ "سالار میرا ہے، سالار میرا ہے" ناول میں سالار خاندان ہمارے معاشرے کی اپر سوسائٹی کا نمائندہ ہے جو نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہر طرح سے دوسروں پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں جاگیر دارنہ نظام کی تصویر کشی کی گئی وہاں سماج میں نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

۔ روبینہ سلطان اپنی کتاب "تین نئے ناول نگار" میں لکھتی ہیں

> "صفر سے ایک تک" سارے کا سارا ناول کمپیوٹر پروگرامنگ انٹرنیٹ اور اس کے استعمال کی نئی نئی دریافتوں کا بیانیہ ہے۔ ناول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کمپیوٹر ہمیں ایک اور ہی دنیا کی شے نظر آتا ہے۔ جس طرح مصنف نے اس ناول کے ذریعے کمپیوٹر پروگرامنگ کی معلومات فراہم کی ہیں وہ نایاب ہیں سائبر سپیس کا منشی جو ناول کا بنیادی کردار ہے وہ کمپیوٹر پروگرامنگ اور نئی نئی ویب سائیٹ سے قاری تو متعارف کرواتا ہے اور مختلف قسم کی گمیز (انسانی گیمز) سے آشنائی کرواتا ہے۔ (۵)

"حسن کی صورت حال خالی۔۔۔۔ جگہیں۔۔۔۔ پُر۔۔۔۔ کرو" ایک جدید، منفرد اور انوکھا ناول ہے۔ کہانی در کہانی کی طرز پر لکھا گیا یہ ناول اردو فکشن میں ایک نیا تجربہ ہے۔ اس سے پہلے اس طرز کے ناول ہمیں اردو ناول نگاری کی روایت میں نظر نہیں آتے۔ زمانہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے نئی سماجی قدریں قائم ہو رہی ہے۔ سیاسی و سماجی صورت حال تبدیل ہو رہی ہیں ادبی منظر نامے میں بھی نئی تھیوریاں آئی ہیں۔ آزادی اظہار میں نئے نئے طریقے، علمیت کی بجائے قصہ گوئی میں دلچسپی کا عنصر پیدا ہو رہا ہے۔ نیا فنکار اپنی ایک الگ پہچان چاہتا ہے۔ اور دوسروں سے منفرد مقام حاصل کرنے کے لیے نئے تجربات کرتا ہے۔ فکشن میں چوں کہ یہ مابعد جدید دور ہے۔ اس دور کے مسائل منفرد اور انوکھے ہیں اس لیے اس کے تحت لکھا گیا فکشن بھی منفرد اور انوکھا ہو گا۔ اس دور میں زندگی اس قدر الجھ گئی ہے کہ انسان جہاں بہت سے مسائل کا شکار ہے۔ وہیں اپنے لیے وقت نکالنا اُس کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے کردار انسانی نفسیات کے قریب محسوس ہوتے ہیں ناول "حسن کی صورت حال" کے کردار فطری معلوم ہوتے ہیں جو روتے ہنستے گاتے بے ہودہ گفتگو کرتے، جنسی عمل میں مصروف رسمیں نبھاتے ہوئے بغاوت پر آمادہ اور ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جب انسانی ذات معاشرتی رکاوٹیں اور حدود و قیود انسانی ترقی، تعمیری عمل اور پر مسرت رویے کو روکنے کی کوشش کرتی ہے تو المیہ (ٹریجڈی) جنم لیتا ہے۔ المیہ وہ آئینہ ہے جس میں ہم پر اپنی ذات کی تمام خوبیاں و خامیاں، کرداری کمزوریاں حدود جذبات اور احساسات نمایاں ہوتے ہیں۔ "ناول حسن کی صورت حال" کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ اس میں بے جان اشیاء بھی کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ مثلاً میز، میگا فون اور وائن کی بوتل وغیرہ مصنف کے نزدیک یہ اش یاء بھی انسانی کرداروں کی طرح اہم ہیں کیونکہ ہماری روزمرہ زندگی میں اشیاء کو انسانوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم اپنی توجہ اشیاء کی

تاریخ بیان کرنے پر صرف کرتے ہیں تو انسانوں کی دنیا کچھ دیر کے منجمد ہو جاتی ہے۔ اور اشیاء ناول کے بیانیے میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں مرزا اطہر بیگ کے آنے والے ناول منفرد انداز بیان، ہیت، تکنیک ہر لحاظ سے ناول کی موجودہ روایت سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں آج کے انسان کے مسائل نفسیاتی الجھنوں، ذہنی و طبقاتی کشمکش کو نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے انسان کو اپنے ناولوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادیب اپنے فن پارے میں اپنے ماحول اور اس سے جڑی زندگیوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ وہاں وسیع پیمانے پر دوسری جگہوں اور ماحول کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ایسے ہی ناول نگار حسن منظر نے اپنے ناول "العاصفہ" میں سعودی عرب کے کلچر اور اس میں پائی جانے والی برائیوں کو سامنے لایا ہے۔ جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ناول "العاصفہ" عرب ملک کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی سماجی ثقافتی زندگی کا عکاس ہے۔ معاشرے میں بڑھتی برائیوں، دکھاوا فریب، لالچ، خود غرضی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن سعید کے کردار کے ذریعے منافق، دھوکے، خود غرض لالچی اور شیطان صفت آدمی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس مقامی کلچر میں دوسروں کی عورتوں کو بُری نظر سے دیکھنا، شادیوں پر شادی کرنا، بوڑھے لوگوں کا نوجوان عورتوں سے شادیاں کرنا عام سی بات ہے۔ حسن منظر نے اپنے تخلیق کئے ہوئے کرداروں کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ انسان کے ظاہر اور باطن کے فرق کو مختلف طریقوں سے دکھایا ہے۔

"العاصفہ" جس کے نام سے ظاہر ہے "سخت آندھی"۔ زید ناول کا کردار مصنف کو اپنے معاشرے کے بارے میں بتاتا ہے اور سوچتا ہے کہ ایک دن ایسی آندھی آئے گی اور سب ختم ہو جائے گا۔ لوگوں کو ان کے اعمال کی سزا ملے گی۔ زید کا کردار سماج سے بغاوت کرنے والا ہے۔ اس کردار کے ذریعے انسان کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ سوسائٹی میں اچھی اور بُری دونوں صورت حال ہوتی ہیں۔ انسان کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کس کو رد اور کس کو قبول کرے۔ اپنے سماج سے بغاوت کرنے والا زید نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔ جو معاشرے میں ضمیر کا استعارہ ہے۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود معاشرے کو تبدیل نہیں کر پاتا۔ عرب معاشرہ اپنی روایت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ ناول "العاصفہ" عرب معاشرے پر انتہائی سخت طنز اور کڑی تنقید ہے۔

انسان کا انسان پر ظلم و جبر زمانہ قدیم سے ہے۔ اعلیٰ طبقے کا صدیوں سے بنایا ہوا استحصالی نظام اور اس کے شکنجے میں پھنسے ہوئے غریب عوام "دھنی بخش کے بیٹے" ناول کا بنیادی موضوع ہے۔ جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ حسن منظر نے اپنے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں ایسے خاندان کو بیان کیا ہے جو صدیوں سے غریب عوام کو اپنے شکنجے میں لیے ہوئے ہے حسن منظر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جہاں استحصالی نظام اور اعلیٰ طبقے کے جبر کو بیان کیا ہے وہاں اُس غریب طبقے کی تعلیمی کمی کو بھی اجاگر کیا ہے کہ وہ جبر ظلم زیادتی کے باوجود بھی صابر اور شاکر ہے اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتے یہی ایک چبھتا ہوا سوال ہے جو مصنف نے اٹھایا ہے۔ جس کے لیے مختلف جگہوں پر مصنف خود کو ظاہر کرتا ہے اور اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے۔

"دھنی بخش کے بیٹے" ناول میں جہاں حقیقت کو مختلف انداز سے مثلاً اعلیٰ طبقے کا اپنے سے نچلے طبقے کو حقر جاننا محنت کا استحصال کرنے والوں پر مشتمل طبقاتی سماجی نظام کو بیان کیا گیا ہے۔ وہیں حقیقت سے تھوڑی دوری کا احساس بھی ہوتا ہے ایک کردار علی بخش جس میں دنیا جہاں کی برائیاں پائی جاتی ہیں وہ جدید ٹیکنالوجی ہونے کے باوجود جاہل ہے۔ ناول میں تمام نسوانی کردار ان پڑھ ہیں حتی کہ قرآن پاک بھی نہیں پڑھ سکتے۔ احمد بخش کے علاوہ تمام کردار جاہل دکھائے گئے ہیں۔ ناول میں دو مرکزی کردار ہیں جو جاگیر دار طبقے کو پیش کرتے ہیں دونوں کردار شخصیت کے لحاظ سے مشرق و مغرب کی مانند ہیں۔ اس ناول میں راوی معاشرے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر قاری پر ظاہر کرتا ہے جس کے لیے وہ انقلابی طریقہ کار اپناتا ہے اور پند نصائح بھی کرتا ہے۔

کوئی وبا جب کسی ملک میں پھلتی ہے تو اس کا ذمہ دار کوئی ایک شخص نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کے تمام رویے مل کر وبا کو تحریک دیتے ہیں مثال کے طور پر دہشت گردی جیسی وبا کے پیچھے اگر دیکھا جائے تو اس کو پھیلانے اور تحریک دینے کے لیے بیرونی قوتیں، غیر ملکی طاقت کار فرما نظر آتی ہے۔ حسن منظر کا ناول "وبا" استعارتی حیثیت رکھتا ہے۔ بظاہر ناول میں چیچک کی وبا کو بیان کیا گیا ہے۔ چیچک کی وبا علاقے میں پھیل گئی ہے۔ اس وبا میں لپٹے ہوئے مریضوں سے ہسپتال اور ڈاکٹر کا نقشہ کھنچا گیا ہے۔ جہاں مریضوں کی حالت بیان کی گئی ہے۔ وہاں ڈاکٹر کے مثبت اور ہمدردانہ رویے کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ (حسن منظر خود ایک ڈاکٹر ہے) ناول میں ڈاکٹرز اپنے فرائض کو بخوبی بنھاتے ہیں لوگوں کے منفی رویوں اور جلی کٹی باتوں کو برداشت کرتے ہیں ڈاکٹر انیس کا کردار فرض شناس اور نرم دل، اپنے فرض کو ہر چیز پر مقدم رکھنے والے شخص کا ہے۔ مریضوں کو ذہنی سکون دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور خود سکون حاصل کرنے کے لیے نیند کی دوا کھاتا ہے لیکن فرض سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ حسن منظر کے روایتی ناولوں میں طریقے سے ہٹ کر جو تبدیلی نظر آتی ہے وہ مختلف زبانوں کی چاشنی کے ساتھ عربی اور انگریزی الفاظ کا ترجمہ بھی فٹ نوٹ میں کر دیا گیا ہے۔

انسان اے انسان! حسن منظر کا ناول ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں حسن منظر نے زمانے کی سازشیں، زمانے کے نشیب و فراز انسانی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیے ہیں۔ انسانی فطرت، سماجی، تاریخی واقعات، پاک و ہند کے فسادات ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد کے حالات، تصوف، فلسفیانہ سوالات اور زندگی پر ان کے اثرات کو ناول میں یکجا کیا ہے۔ ناول کا آغاز آٹھ سالہ تلمیذ کے کردار سے ہوتا ہے۔ جسے بے راہ روی سے بچانے کے لیے اپنی ماں کی محبت سے دور بہن اور بہنوائی کے گھر سخت ماحول میں بھیج دیا جاتا ہے لیکن نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور تلمیذ کا کردار ایک باغی شخص کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اپنوں کی بے رخی کے سبب تلمیذ تمام رشتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ناول میں یہ کردار ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے والدین کے سلوک کو یاد رکھتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اُسے گھر سے باہر بھیجا۔ انسان اے، انسان! ناول میں انسانی جذبات غم و غصہ، انتقام، احسان مندی، شکر گزاری، اضطراب اور بے چینی کی کیفیت کرداروں کو حقیقی زندگی کے قریب تر کر دیتی ہے۔ تمام کردار زندہ جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں فلسفیانہ موضوعات مذہب، عقیدے خاص طور پر خدا کے وجود پر بحث کی گئی ہے۔ جو مادیت پرست، الہیاد اور عقیدے کے درمیان گھومتی ہے۔ مذہب سے دوری کی بناء پر پیدا ہونے والے مصائب کو سپرد قلم کیا ہے۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ناول میں وجود حقیقی کے متعلق بحث و مباحث کرتے ہیں۔ تصوف ادب کا ایک اہم موضوع ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کے ناول میں اس موضوع پر مصنفین نے میں کم ہی لکھا۔ حسن منظر نے روایت سے جڑے ہوئے جہاں دوسرے موضوعات کو ناول میں جگہ دی وہیں انسان اے، انسان! میں تصوف کو بھی شامل کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار تلمیذ جو ہر چیز سے باغی ہو چکا ہے اور بہت سی برائیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے بڑی مہارت سے تلمیذ کی ذہنی الجھنوں اور سوالات کا جواب دے کر اُسے سکون فراہم کیا ہے۔ ناول کے آخر میں تلمیذ خدا کے سامنے اپنے گناہوں اور خطاؤں کا اعتراف کر کے اپنی ساری زندگی کی ذہنی کشمکش سے رہائی حاصل کرتا ہے۔

اردو ادب میں تقسیم ہند کے فسادات اور واقعات کو خاص جگہ دی جاتی ہے اور تقریباً ہر ادیب نے اپنے انداز سے اُس غم کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں تلمیذ کی کہانی کے ساتھ فسادات، برطانیہ کا ماحول، ہندوستانی معاشرت تقسیم ہند اور بعد کے واقعات کی دردناک داستان بڑی تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ تقسیم کے وقت لوگوں کو اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا پڑی جس کے لیے وہ لوگ اپنوں کی دوری اور تکلیف برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ اُس وقت انسان کن مسائل و مصائب کا شکار تھا۔ اس کی ناول میں عکاسی کی گئی ہیں۔ ناول انسان اے، انسان! کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ واقعات میں تسلسل و ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے ناول "کئی چاند تھے سر آسمان" کی طرح حسن منظر نے اپنے اس ناول میں جس عہد کو بیان کیا ہے۔ اُسی عہد کی زبان استعمال کی ہے۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے ثقافتی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ زبان میں جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ ہمیں ناول میں بھی نظر آتی ہے۔ انسان اے، انسان! کے اسلوب بیان میں مختلف زبانوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ افراد کی عام بول چال روزمرہ

محاورات، ضرب الامثال، ہندی آمیز اردو الفاظ کرداروں کی شخصیت ذہنیت اور انفرادیت کو ابھارتے ہیں۔ مختلف جگہوں کو بغیر نام لیے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے وسیع معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ہر قاری اپنے ذہن کے مطابق اس جگہ کو سوچتا ہے جو کہ ناول کی ایک خاص خوبی ہے۔ مجموعی طور پر ناول کی فضاء حساس اور اداس ہے لیکن کہیں کہیں مکالموں سے طنز و مزاح کی شگفتگی بھی دیکھائی دیتی ہے۔

ادب میں محبت ایک گہرا احساس ہے۔ جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ انسان کو انسان سے محبت دوسرے جانداروں سے پیار، اپنے ارد گرد کی جگہ اور ماحول سے انس، لگاؤ ہو جاتا ہے۔ علی اکبر ناطق کا ناول "نو لکھی کوٹھی" جو ۲۰۱۴ء میں سنگ میل سے شائع ہوا۔ اس ناول میں محبت، سیاست اور فسادات کو موضوع بنایا گیا۔ "نو لکھی کوٹھی" ناول میں تاریخی واقعات قیام پاکستان سے پہلے انگریزوں کی سیاست اور علاقائی سیاست کو اچھے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ولیم ایک انگریز ہے۔ جو ہندوستان میں اپنی آبائی کوٹھی سے محبت کرتا ہے اور اسے برطانیہ سے عزیز سمجھتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام نو لکھی کوٹھی میں گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جس کے لیے وہ اپنے بیوی بچوں اور دوسرے انگریزوں کے ساتھ انگلستان واپس نہیں جاتا ہے۔ ولیم انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان آتا ہے۔ جلال آباد اپنے گھر نو لکھی کوٹھی میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے۔ اس گاؤں کا نام پیدا کرنے لیے محنت کرتا ہے جس کے لیے وہ بچوں کی تعلیم کا انتظام کرواتا ہے۔ ولیم جہاں اپنے گاؤں سے محبت کرتا ہے۔ اسے باقی ہندوستان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اکیسویں صدی میں ناول کا ایک خاص موضوع اولاد کا اپنی ترقی کے لیے اپنے والدین کو چھوڑ کر دوسرے ممالک چلے جانا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ناول "نو لکھی کوٹھی" جدت کا حامل ہے کہ ولیم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واپس برطانیہ نہیں جاتا بلکہ اپنی محبت جہاں وہ پیدا ہوا پلا بڑھا جس کے لیے وہ برسوں تک کشش محسوس کرتا ہے وہیں رہ جاتا ہے۔ ناول کے آخر میں ولیم ایک درخت سے لپٹا اُسے نہ کاٹنے کی درخواست کرتا ہے۔ جو نو لکھی کوٹھی میں ہے لیکن اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ کوٹھی کسی اور شخص کو الاٹ کر دی جاتی ہے۔ بوڑھا انگریز وہاں سے بیدخل کر دیا جاتا ہے۔ ولیم اس کے بعد اُسی علاقے میں ایک بنگلے میں پناہ لیتا ہے جب لوگ اُسے پوچھتے ہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واپس کیوں نہیں گیا تو وہ بتاتا ہے کہ وہ یہیں پیدا ہوا یہیں پلا بڑھا اُس کا برطانیہ سے کوئی تعلق نہیں تو وہ واپس کیوں جائے۔ اپنی خواہش کے مطابق اپنے گاؤں میں رہتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد مر جاتا ہے۔ جگہ سے محبت کی ایسی ہی مثال ہمیں اکیسویں صدی میں حمید شاہد کے ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" میں بھی نظر آتی ہے۔

ناول "نو لکھی کوٹھی" کا پلاٹ سادہ ہے۔ بیک وقت ناول میں دو کہانیاں گردش کرتی نظر آتی ہیں۔ انگریزوں کا مقامی باشندوں کیسا تھ رویہ دوسرا مقامی باشندوں کا وراثت میں ملی دشمنی کی بناء پر ایک دوسرے کا قتل و غارت سودھا سنگھ اور غلام حیدر اپنے باپ دادا کی دشمنی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ واقعات ۱۸۵۷ء سے تقسیم ہند کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان قتل و غارت اور بربریت کا نقشہ جو تاریخ میں نظر آتا ہے۔ علی اکبر ناطق نے "نو لکھی کوٹھی" میں اُسے جگہ دی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت پیدا ہونے والی کش مکش، ہجرت کے فسادات، ہندو اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے جارحانہ رویہ اردو فکشن میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ ناول میں انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ انگریز حاکموں کا رویہ اپنے سے کم تر کو حقیر جاننا اور سرکاری عہدوں کے لیے انگریزوں کو ہی ترجیح دینا، مقامی باشندوں کو خاطر میں نہ لانا جو ہم تاریخ کے اوراق میں دیکھتے ہیں ناول میں بھی نظر آتا ہے لیکن اس لحاظ سے ولیم انگریز کا کردار اچھے بُرے دوستانہ دشمنی کے ملے جلے جذبات رکھتا ہے۔ یہ کردار اپنے کام کے ساتھ مخلص نظر آتا ہے۔ ناول کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ کرداروں کے مطابق مکالمے بیان کیے گئے ہیں۔

انسان خود کو جاننے اور پہچانے کے لیے مسلسل تگ و دو کرتا رہتا ہے اس کے لیے بہت محنت اور کاوش کرتا ہے لیکن یہ ایک بڑا المیہ ہے اپنی ہی پہچان کے لیے اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ حقیقت سے اتنا دور چلا جاتا ہے کہ واپس پلٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس المیے کو عہد حاضر کے لکھنے والے عاصم بٹ نے اپنے ناول "دائرہ" کا موضوع بنایا کہ انسان اپنی ہی تلاش میں سرگردان اور اپنی کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس دنیا میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اپنی اصل کو بھول جاتا ہے ناول کا مرکزی کردار "راشد" ناول میں بننے والی فلموں میں اداکار ہے اور اپنے کردار کو نبھاتے نبھاتے باہر کی دنیا کو فراموش کر دیتا ہے اگر اس ناول کو اس دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو تمام انسان ایک فلم کے کردار ہیں جو اپنا اپنا کردار نبھا رہے ہیں اور اپنے کردار کو نبھانے میں اتنے محو ہو چکے ہیں کہ یہاں آنے کا مقصد بھول چکے ہیں۔ ناول کا موضوع ہر انسان کی زندگی کا موضوع ہے۔ ناول میں تین کہانیاں بیان کی جاتی ہے اور تینوں ہی نامکمل ہیں جو کہ عنوان "دائرہ" کی خوبی ہے۔ راشد کو "استعارتی" حوالے سے آج کا انسان دکھایا گیا ہے اس کردار کے ذریعے مختلف بہروپ کے ساتھ زندگی گزارنے والے انسان کا داخلی کرب سمٹ کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

"ناتمام" عاصم بٹ کا ناول ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے اندرون شہر لاہور کی رونق اور افراتفری کے بیان کے ساتھ ساتھ ایسی خواتین کا المیہ دکھایا ہے۔ جو اُس سوسائٹی میں اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کر نہیں سکتیں اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے باغی ہو جاتی ہیں اور اپنی زندگی کی ہنگامہ خیز صورت حال پریشانیوں اور مسائل کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔

ناول میں مصنف اپنے قارئین کو اندرون شہر لاہور لے جاتا ہے۔ جس میں زندگی بڑی تیز رفتاری سے چلتی ہے۔ اس ناول میں عاصم بٹ نے شہر لاہور کی روایات، ثقافت، پیار و محبت کے علاوہ اندروں شہر لاہور میں بسنے والے رہائشی کی سازشیں بھی سامنے لے کر آتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ عاصم بٹ خود اندرون شہر لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو انہوں نے ناول کے کینوس میں سمونے کی کاوش کی ہے۔

ناول میں صائمہ کا کردار اس سوسائٹی کی ایک باغی خاتون کا کردار ہے۔ صائمہ انتہائی تنگ لیکن پر رونق علاقے کی رہائشی تھی۔ جو اپنی بیوہ ماں اور طلاق شدہ بہن کو برداشت نہیں کر پاتی۔ اپنے گھر اور روز مرہ مصروفیت سے تنگ آکر اپنی رہائش گاہ ملتان میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے چلی جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات وسیم نامی لڑکے سے ہوتی ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد صائمہ باغی ہو جاتی ہے۔ اور لاہور میں بھی صائمہ اور وسیم کی خفیہ ملاقاتیں ہونے لگتی ہیں۔ چوری چھپے ملنے سے ان دونوں کی جسمانی قربت میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن یہ راز زیادہ عرصے تک راز نہیں رہتا اور صائمہ کی بڑی بہن پر اس راز کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ وسیم اس میں اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے اور صائمہ کو چھوڑ کر واپس ملتان چلا جاتا ہے۔ اور وہاں سے اپنی تعلیم کے لیے فلپائن کا رخ کرتا ہے۔

صائمہ اسقاط حمل کے لیے ایک دایہ کو تلاش کرتی ہے جو اُس کے ناجائز بچے سے اُس کی جان چھوڑانے میں مدد کرے۔ صائمہ کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے اُسے ایک خاتون مل جاتی ہے۔ جو صائمہ کو اس مشکل سے نجات دلانے کے علاوہ ایک نرسنگ سکول میں اُس کا داخلہ کروانے میں مدد کرتی ہے۔ صائمہ کی مشکلات مزید بڑھتی ہیں جب اُس کا انچارج ڈاکٹر وقاص اُسے شادی کی پیش کش کرتا ہے۔ جسے صائمہ قبول کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر وقاص ایک صنعت کار کی بیٹی سے پہلی شادی کر چکا تھا۔ جو اپنی بیگم سے تنگ ہے ڈاکٹر وقاص ایک خوبصورت سوشل لڑکی سے مل کر کشش محسوس کرتا ہے۔ اور صائمہ سے شادی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر وقاص کی بیوی اپنے سخت رویہ سے ڈاکٹر کی جان لے لیتی ہے اور صائمہ پھر سے اکیلی ہو کر رہ جاتی ہے "ناتمام" جیسا کہ ناول کے

عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ "ادھورا" نہ ختم ہونے والا"۔ اس کو عاصم بٹ نے مختلف طریقے سے دیکھا ہے۔ امیرانہ طبقے کا دوسروں پر اپنی رائے مسلط کرنے والا رویہ اور عورتوں کا معاشرے میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہ بسر کرنے کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔

"مٹی آدم کھاتی ہے" علامتی انداز حقیقت پر مبنی محمد حمید شاہد کا ناول ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ مٹی کی محبت سے پیدا ہونے والے المیوں کو مختلف جہات کے ساتھ دکھایا ہے۔ مٹی سے تخلیق ہوا انسان اس مٹی کے لیے اس مٹی کے سینے پر قتل وغارت کرتا ہے۔ اس محبت نے انسان کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ جس کے لیے دوسروں کی حقوق کی پامالی، کمزور پر ظلم وجبر کرتا ہے۔ دولت کی ہوس نے انسان کو اندھا بنا دیا ہے۔ انسان کی یہ خواہش کہ ساری کی ساری مٹی اسی کی ہو جائے اس بات کو پورا کرنے کے لیے جائز ناجائز تمام راستے اختیار کرتا ہے اور بالاخر اسی مٹی میں چلا جاتا ہے۔ ناول کا کردار "سلیم اللہ" اپنے خاندان سے مٹی کی محبت میں دیوانہ ہو جانے سے نالاں اور پریشان ہے اور نیم پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔

ناول کے دیباچے میں شمش الرحمن فاروقی لکھتے ہیں۔

> "مٹی آدم کھاتی ہے" اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان کی حقیقت سے آنکھ ملانے کی کوشش رومان اور تشدد کو یکجا کر دیتی ہے۔ اسے محمد حمید شاہد کی بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ وہ ایسے موضوع کو بھی اپنے بیانیہ میں بے تکلف لے آتے ہیں جس کے بارے میں زیادہ تر افسانہ نگار گومگو میں مبتلا ہوں کہ فکشن کی سطح پر اس سے کیا معاملہ کیا جائے۔"(۵)

عصر حاضر میں ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہے۔ ہر طرف افراتفری اور شوروغل ہے۔ ہر انسان اپنے حصے کا دوڑ رہا ہے۔ ہر چکر اس کی زندگی کو کم کر دیتا ہے اور ایک دن اپنے حصے مکمل کر کے اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ نکہت حسن کے ناول "جاگنگ پارک" میں تنہائی اور بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا کردار زبیدہ جو ادھیڑ عمر ہے اس کے بچے اپنے روشن مستقبل کے لیے امریکہ چلے گئے ہیں۔ ایک بیٹا کینسر کے موذی مرض سے وہیں مر جاتا ہے جب کہ دوسرا واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ بنیادی طور پر ایک مشرقی عورت کی داستان ہے۔ جو زندگی کے مصائب اور دکھوں کا سامنا کرتی ہے اور سماج کا تنہا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کا ڈاکٹر جو برسوں سے اُس کا علاج کر رہا ہے اسے مفید مشورے دیتا ہے لیکن بے حس اور جذبات سے عاری ہے۔ زبیدہ روز جاگنگ پارک جاتی ہے۔ جاگنگ پارک وقتی طور پر انسان کو تنہائی کے کرب سے بچا لیتا ہے لیکن انسان اپنے اردگرد پھیلی دنیا کے مسائل اور دکھ ساتھ لے کر واپس گھر لوٹ جاتا ہے۔ ناول میں شہری زندگی سے جڑی افراتفری، بے حسی، انسان کن نئے حالات مسائل سے دوچار ہے اور کس کرب سے گزر رہا ہے اس کرب کو بیان کہا گیا ہے۔ جاگنگ پارک ایک ایسا استعارہ ہے جو آج کے انسان کی زندگی کو پیش کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ زندگی ہی جاگنگ پارک ہے جس میں ہر کوئی اپنے حصے کا دوڑ رہا ہے ہر چکر اس کی زندگی کی کم کر دیتا ہے۔ بالا آخر ایک چکر ایسا ہوتا ہے جو انسان کی زندگی کا آخری چکر ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس پارک میں لوگوں کی افرتفری کم نہیں ہوتی ایک چکر کسی کی زندگی کا آخری چکر ہوتا ہے وہی کسی دوسرے کی زندگی میں پہلا چکر ہوتا ہے۔ جس سے کائنات کا یہ نظام یونہی چلتا رہتا ہے۔

اکیسویں صدی کے انسان کا ایک اہم مسئلہ تنہائی ہے اس کو دور کرنے کے لیے مختلف طریقے اور مصنوعی سہاروں کا متلاشی ہے۔ نجمہ سہیل کا ناول "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" میں بھی ایسے بوڑھے آفتاب عالم کی کہانی ہے جس کے بیٹے امریکہ شفٹ ہو گئے۔ آفتاب عالم اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے اخبار میں اشتہار دیتا ہے میں زندہ ہوں اگر میرے دوستوں میں سے کوئی زندہ ہے تو وہ مجھ سے رابطہ کرے اس طرح اس کے دوست اس سے رابطہ کرتے ہیں۔ نجمہ سہل نے بڑی مہارت کے ساتھ تمام دوستوں کو موت کے لیے اکٹھا کیا ہے۔ "" کنجری کا پل" ناول کا موضوع اردو ادب کے لیے کوئی نیا

موضوع نہیں ہے۔ اس میں تین طوائفوں کی کہانی بیان کی گئی ہے لیکن یونس جاوید نے اسے جدید انسان کی جنسی نفسیاتی الجھنوں، معاشرے کے منافقانہ رویوں کے بیان سے موضوع میں وسعت پیدا کی ہے۔ ناول کی کہانی مشتاق مالی اور اس کی بیوی ظہرہ مشتاق کے گرد گھومتی ہے مشتاق مالی دبئی میں ہے۔ اسکی بیوی اس کی غیر موجودگی میں ایک بوتیک کھولتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کام کو جنسی قیمت سے بڑھایا جاتا ہے۔ دبئی سے واپسی پر مشتاق مالی روپے کی ہوس میں اپنی بیوی کے شبستان کی چوکیداری کرنے لگتا ہے۔ ظہرہ مشتاق جب صراط مستقیم کی طرف آنا چاہتی ہے تو نام نہاد صوفی اسے جسمانی طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صوفی کے کردار کے ذریعے مذہب کے نام پر تضاد اور منافقانہ رویہ اور لوگوں کی ذہنی سطحیت انسان کے باطن میں چھپائے ہوئے بھیڑیا کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ظہرہ اور مشتاق مالی معاشرے میں ہونے والی بے جوڑ شادی سے پیدا ہونے والے مسائل اور انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ "کنجری کا پل" ایک علامتی پل ہے جن سے گزرتے وقت چند سکینڈ کے لیے ہی قاری اپنے باطن میں جھانکتا ہے۔ "کنجری کا پل" ناول کا موضوع نیا نہ سہی لیکن کہانی کی تلاش میں مصنف اسے المیے کی طرف لے جاتا ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کراہت محسوس کرتا ہے۔ وہ رشتے جنہیں اللہ نے تقدیس اور وقار بخشا ہے وہی رشتے چند روپیوں کے عوض گناہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تو ایک وقت ناول میں ایسا آتا ہے کہ کرداروں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن

جب تک معاشرے میں اس طرح کا استحصال روا رکھا جائے گا ان موضوعات پر قلم بھی اُٹھتا رہے گا۔

"کاغذی گھاٹ" ناول میں ہندو، مسلم تضادات و تعصبات دونوں کی تہذیب و ثقافت اور پاکستان بن جانے کے بعد کی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ خالدہ حسین کا یہ ناول ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں نسوانی کردار نوجوان لڑکیاں تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ صدیوں پر مشتمل استحصال اور جبر کا شکار عورت آزادی کی خواہش لیے ہوئے ہیں۔ جو اُس معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتیں ہیں۔ لیکن یہ المیہ ہی "کاغذی گھاٹ" کا خاص موضوع ہے کہ یہ لڑکیاں بہت محنت کے باوجود استحصالی نظام کو تبدیل نہیں کر پاتیں۔ ناول میں مونا کا کردار تعلیم یافتہ ہے جو جبر کے خلاف واضح سوچ رکھتی ہے لیکن اس کے خلاف عملی طور پر اُسے کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ ناول کے ہر کردار کو ہم مونا کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ناول کی کہانی اور خالدہ حسین کی ذاتی زندگی کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ مونا کی زندگی کے بہت سے واقعات مصنفہ کے اپنی حالات زندگی سے میل کھاتے ہیں۔ مونا کے کردار پر مصنفہ کی شخصیت کا گمان ہوتا ہے ایک لڑکی جو ادیبہ ہے۔ وقت کی ستم ظریفی، تاریخ کے جبر قدر پر غور و فکر کرتی ہے۔ معاشرے کی سیاسی سماجی فکری صورت حال کا قلم بند کرتی ہے۔ نصف صدی کے معاشرتی کرب کو سمیٹے ہوئے خالدہ حسین ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آنکھ سے ہمیں تقسیم ہندوستان سے قبل قیام پاکستان کے بعد وقوع پذیر معاشرہ، سقوط ڈھاکہ سب کچھ دکھاتی ہے۔ جو کم و بیش مصنفہ کا اپنا عہد بھی ہے۔ "کاغذی گھاٹ" انسانی ذات کے کرب ناک سفر کی ایسی علامت ہے جہاں امید کی کشتیاں کنارے نہیں لگتی۔ بلکہ ناامیدی کی موجیں ان کو بہا کر لے جاتی ہے۔

تعلیم یافتہ، انقلابی حالات کی لڑکی مونا تمام تر اختلاف کے باوجود اپنے نظریات پر قائم رہتی ہے۔ ""حاصل گھاٹ" فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا بانو قدسیہ کا ناول ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ ناول کا مرکزی کردار ہمایوں اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ ماضی میں گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہمایوں کا کردار ایک ایسے فرد کا کردار ہے جو بڑھاپے کی تنہائی میں اپنی گزاری ہوئی زندگی کی یادوں کا سہارا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح نجمہ سہیل کے ناول "اندھیرا ہونے سے پہلے" میں آفتاب اپنی پرانی یادوں کو تلاش کرنے نکل پڑتا ہے۔ آفتاب اور ہمایوں دونوں کردار اپنی بیویوں کی وفات کے بعد ان کی محبت کو یاد کرتے ہیں۔ "حاصل گھاٹ" میں دو تہذیبوں کے تصادم اور اس سے جنم لینے والی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ بہت سے پاکستانی غیر ملکوں میں آباد ہیں اور ان کے بزرگ غیر ملکی کلچر اپنانے میں دقت محسوس کرتے ہیں اور بچے پاکستان آکر اجنبیت محسوس کرتے ہیں "حاصل

گھاٹ ایک فکری ناول ہے جس میں مشرق اور مغرب کے تناظر میں انسان کو دکھایا گیا ہے۔ آج انسان فلاح کے راستے کو چھوڑ کر پُر کشش راستے پر چلنے کا خواہاں ہے۔ جس کے لیے بانو قدسیہ نے ناول میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کیا ہے۔ ناول کے آخر میں ناول کا کردار ہمایوں وطن واپس پاکستان آ جاتا ہے۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہماری تہذیب کو اپنے اصل مقام کی طرف، اصل مرکز کی طرف مراجعت کرنا پڑے گی۔ ڈاکٹر روبینہ سلطان اپنی کتاب "تین نئے ناول نگار" میں لکھتی ہیں۔

> "اس ناول کا موضوع تو روایتی ہے لیکن اسلوب میں جدت نظر آتی ہے اس ناول کا مرکزی خیال دو تہذیبوں کی آویزش ہے اور بانو قدسیہ نے دو تہذیبوں کے تصادم کو اجاگر کرنے کی بجاے ان تہذیبوں کے منفی پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ۔"(۷)

انسان کو انسان اور دوسری چیزوں کی اہمیت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب تمام رشتے اور اس سے جڑی تمام اشیاء انسان سے دور کر دی جاتی ہیں۔ نجمہ سہیل کا پہلا اور آخری ناول ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ایک ایسے بوڑھے آفتاب عالم کی کہانی ہے۔ جس کے بیٹے امریکہ شفٹ ہو گئے ہیں اور اپنی ماں کے گزر جانے کے بعد ایک بیٹا واپس آ کر اپنی ماں کی ڈائری اپنے باپ کے سپرد کرتا ہے۔ اس ڈائری میں نجمہ سہیل نے ایک ایسی عورت کی زندگی کے تمام تر اہم واقعات بیان کیے ہیں جو اپنے خاوند کی پرستش کرتی ہے۔ عفت کا کردار اپنی تمام تر مظلومیت کے باوجود ایک خاموش محبت کرنے والی، قربانی دینے والی عورت کا کردار دیکھایا گیا ہے۔ جو مشرق کی تہذیبی نمائندگی کرتا ہے۔ آفتاب عالم، عفت کی ڈائری پڑھ کر بہت پشمان ہوتا ہے۔ لیکن اب وہ زندگی کے ایسے موڑ پر ہے کہ اپنی زیادتیوں کا ازالہ بھی نہیں کر سکتا۔ آفتاب عالم اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے اخبار میں اشتہار دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگر اس کے دوستوں میں سے کوئی زندہ ہے تو اس سے رابطہ کرے۔ اس طرح اس کے دوست اس سے رابطہ کرتے ہیں اور اس کی محبوبہ بھی مل جاتی ہے۔ جو برسوں پہلے اسے اطلاع کیے بغیر اس کی زندگی سے چلی گئی تھی۔ نجمہ سہیل نے آفتاب عالم کے کردار کے ذریعے معاشرے کے ایسے شخص کو بیان کیا ہے جو ان رشتوں کو یاد کرتے ہیں جن سے وہ دور ہوتے ہیں۔ آفتاب عالم بھی یہی سوچتا ہے اگر اُس کی محبوبہ اُسے مل جاتی تو ہو سکتا تھا کہ اُس کی زندگی جتنی سلیقے سے گزری ویسی ممکن نہ ہوتی۔ اُس کا تمام تر سہارا اس کی بیوی کی بدولت ہی تھا۔ "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" ناول ایک سادہ تحریر ہے جو معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ انسان رشتوں کے کھو جانے سے ان کی اہمیت اور خوبصورتی کو سمجھتا ہے۔ نجمہ سہیل سے پہلے بانو قدسیہ نے بھی اپنے ناول "حاصل گھاٹ" میں پرانی یادوں کے سہارے زندگی گزارنے کی ترکیب بیان کی ہے۔

خود مختاری اور آزادی ہر ذی روح کی ازلی خواہش رہی ہے ہر شخص خود کو منوانے کی چاہ میں اپنی پہچان کے لیے مختلف طریقے اور وسیلے تلاش کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کے تقریباً تمام ناول نگاروں کا ایک اہم موضوع، انسان کی پہچان، کھوج تلاش خود کو جاننے کی کوشیں اپنا لوہا منوانے کی تڑپ رہا ہے۔ ناول "دائرہ" کا کردار "راشد" خود کو جاننے کے لیے کرب ناک کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ "العاصفہ" کا زید "غلام باغ" کبیر "صفر سے ایک تک" کا ذکاء اللہ سبھی کردار خود کو منوانے اور اپنی پہچان کے لیے مختلف طریقے اپناتے ہیں۔

جہاں اکیسویں صدی کے ناولوں میں مرکزی کردار اپنی تلاش میں محو ہے وہی ضمنی کرداوں سے اس موضوع کی جھلک نظر آتی ہے۔ اپنے روشن مستقبل کے لیے دوسرے ممالک شفٹ ہو جاتے ہیں اور اپنی پہچان کی تلاش میں مدہوش ہو رہتے ہیں۔ نکہت حسن کا "جاگنگ پارک" نجمہ سہیل "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" بانو قدسیہ "حاصل گھاٹ" مستنصر حسین تارڑ "قربت مرگ میں محبت" تمام ناولوں میں مرکزی کرداروں کی اولاد کا سمندر پار بسنا بھی خود کو منوانے کی چاہ کو ظاہر کرتا ہے۔ تمام کردار اپنے روشن مستقبل کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

"جاگنگ پارک" "حاصل گھاٹ" "قربت مرگ میں محبت" "اندھیر ہونے سے کچھ پہلے" ناولوں میں بڑھاپے میں والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جابسنا اس عہد کی مادیت پرستی، دولت کی ہوس کو ظاہر کرتا ہے۔ دولت کی ہوس نے اپنوں کو اپنوں سے دور کر دیا جہاں جدید ٹیکنالوجی نے انسان کے فاصلوں کو کم کر دیا۔ وہاں انسان کو جذبات سے عاری بھی کر دیا۔ جو اس عہد کا ایک وسیع موضوع ہے۔ جس میں والدین کی تنہائی، کرب انگیز محرومیوں کا بیان ہے۔ مصنفین نے اپنے عہد کے پیچیدہ سوال کو اٹھایا ہے اور بڑے ادیب عموماً معاشرے سے بڑا سوال ہی کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں اولاد کا اچھے روشن مستقبل کے لیے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونا اہم موضوع ہے۔ وہیں محمد سعید شیخ کے ناول "ایک اور دریا" میں جاگیر دار طبقے کا اولاد کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنے سے کم تر غریب سے شادی کرنا اور بچے کی پیدائش کے بعد اپنی بیوی کو حقیر اور کم ذات ہی سمجھتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے جدت کا احساس دلاتا ہے۔ جس میں مصنف نے انسانی زندگی کے دکھ، خوشی، غم، اور اعصابی تناؤ کو فلسفیانہ انداز بیان کی بجائے سادہ انداز اختیار کرتے ہوئے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

محبت ادب کا ایک اہم موضوع ہے۔ ہر صنف ادب میں محبت کو خاص مقام حاصل ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں بڑھاپے کی محبت سے چاشنی پیدا کی گئی۔ "ڈاکیا اور جولاہا" میں رودین ایک شادی شدہ ادھیڑ عمر عورت کی یک طرفہ محبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہی بڑھاپے میں جوانی کی محبت کے احساس کو از سر نو زندہ کیا گیا ہے۔ بڑھاپے میں پہلی محبت کا احساس پھر سے دروازہ کٹکھٹاتا ہے۔ بانو قدسیہ کا "حاصل گھاٹ" نجمہ سہیل کا "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" مستنصر حسین تارڑ کا "قربت مرگ میں محبت" میں بیوی کی رحلت کے بعد اپنی پہلی محبت سے ملتے ہیں لیکن ان سے ملنے کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ اُن کی زندگی میں ہوتیں تو شاید آج ان کی زندگی جتنی کامیاب ہے اتنی کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ ان کی تمام تر مادی ترقی کا سہرا ان کی بیوی کی ہی بدولت تھا۔ "حاصل گھاٹ" اور "اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے" میں دونوں اپنی بیویوں کی وفات کے بعد اپنی پرانی یادوں کی کھوج میں نکل پڑتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کے اندر احساس بیدار ہو جاتا ہے کہ قدرت نے جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ان سب کے لیے بہتر تھا۔

خیر و شر دونوں رویے لکھنے والوں کے ہاں نظر آتے ہیں۔ نجمہ سہیل کا ناول "اندھیرا سے کچھ پہلے" میں صوفی کا کردار ایک ذمہ دار شخص ہے جو اپنی آبائی گدی سنبھال لیتا ہے اور پھر اس کو احسن طریقے سے نبھاتا ہے جب کہ اس کے برعکس یونس جاوید کے ناول "کنجری کا پل" میں مذہب اور روحانیت کے نام پر لوٹنے والے بھڑیے کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ جو بڑی چالاکی سے اپنے باطن کو چھپائے رکھتا ہے۔ لیکن ظہرہ جب اس سے جنسی تعلق قائم کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اس کے اندر حیوان جاگ اٹھتا ہے۔ "صفر سے ایک تک" کا پیر خود کو جعلی کہہ کر (ثناء اللہ ثنائی عرف جعلی پیر) لوگوں کو اپنے شکنجے میں لیتا ہے اور ایک بڑے روحانی ڈیرے پر شاہانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مذہب کے نام پر منافقت، تضاد، دھوکا، فریب، جنسی و دولت کی ہوس کو اجاگر کیا گیا ہے جو کہ معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کرتی ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ملاؤں اور صوفی کے سارے اعمال ریاکاری اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اکیسویں صدی کے ناول میں جہاں نئے موضوعات کو وسعت دی گئی وہی اپنی روایت سے جڑے رہنے کا بھی احساس ہوتا ہے اردو ناول کا ایک بڑا موضوع طوائف اور اس کی زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں جو انسانی معاشرے میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ اردو ناول نگاری میں اس کی ٹھوس ابتداء "امراؤ جان ادا" کے کردار ہوتی ہے، شمس الرحمن فاروقی نے "کئی چاند تھے سر آسمان" میں وزیر خانم کا کردار پیش کیا جو کہیں "امراؤ جان ادا" کے کردار سے مشابہت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے کردار میں تہذیب، شائستگی، نفاست، زبان دانی، طرز تکلم کا بیان ہے اسی کردار کے بہانے دو صدیوں کی تہذیب معاشرت کو ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ رحمان مذنب کے ناول "باسی گلی" میں "امراؤ جان کی طرح لڑکی کا اغواء ہونے کے بعد اس کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب کہ ان کے دوسرے ناول "گلبدن" میں ہی بازار حسن کی طوائف کی کہانی ہے۔ جو رشتہ ازواج میں منسلک ہونے کے بعد جن نشیب و فراز کا

شکار ہوتی ہے۔ اپنی نفسیاتی الجھنوں سے دوسروں کو کن مصائب میں دھکیلتی ہے اُس کی عکاسی کی گئی ہے۔ وقت کی تبدیلی سے طوائف کا منصب بھی تبدیل ہو گیا اور کال گرل تک آتے آتے یہ ڈھانچہ مکمل طور پر زوال پذیر ہو گیا۔ "کنجری کا پل" میں ظہرہ مشتاق جنسی قیمت وصول کرتی ہے جہاں طوائف کا منصب تہذیب اور شائستگی سے شروع ہوتا ہے۔ تو اب وقت اور انسانی ذہنوں کی تبدیلی سے جنسی اور دولت کی ہوس تک آ گیا ہے۔ "کنجری کا پل" میں دولت کی ہوس کو عروج پر دکھایا گیا ہے کہ ظہرہ کا مجازی خدا وطن واپسی پر خود اپنی بیوی کے شبستان کی چوکیداری کرنے لگتا ہے۔ اس صدی کے ناولوں میں خواتین کا المیہ دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" میں صائمہ کا کردار اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو صائمہ دھوکے اور فریب کا سامنا کرتی ہے۔ خالدہ حسین کے ناول "کاغذی گھاٹ" میں مونا معاشرے کی ستم ظریفوں اور جبر پر غور کرتی ہے لیکن اسے تبدیل کرنے کے لیے کچھ کر نہیں پاتی ہے۔

یونس جاوید "کنجری کا پل" میں ظہرہ مشتاق کا کردار ایسا ہے جو اپنے گناہوں سے شرمندہ ہے اور توبہ کرنے کے لیے مختلف راستے تلاش کرتی ہے لیکن لوگ اُسے غلط ہی تصور کرتے ہیں اور اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف "صفر سے ایک تک" میں جعلی پیر کی مرید خاتون ایک طرف اُس کی خدمت کرتی ہے تو دوسری طرف ثناء اللہ (پیر) کے کہنے پر اس کے ہی بھائی ذکی کو لبھاتی ہے۔ حسن منظر کے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورت ہی عورت کی دشمن بن گئی ہے۔ ناول کے کردار علی بخش کی پہلی بیوی اپنے خاوند کا چھوٹی بچیوں کے ساتھ جنسی تعلق بنانے میں ساتھ دیتی ہے۔

امیرانہ طبقے کا دوسروں پر اپنی رائے مسلط کرنے کا رویہ ہمیں اکیسویں صدی کے بہت سارے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ "غلام باغ" میں یاور عطائی امیر ہو جانے کے بعد لوگوں کو اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" میں ڈاکٹر کی بیوی دولت مند ہونے کی وجہ سے اُس پر اپنا حق سمجھتی ہے۔ جب وہ دوسری شادی کر لیتا ہے تو اُسے قتل کر دیتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ کا ناول "صفر سے ایک تک" میں سالار خاندان کا دوسروں کو اپنے سے کم تر حقر جاننا اور حسن منظر کے ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں علی بخش کا کردار ہر چیز پر اپنا حق سمجھتا ہے اور جاگیر دانہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس صدی میں جہاں انسان کے نفسیاتی مسائل اور ذاتی کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے وہاں سیاسی و سماجی حالات و واقعات کا بھی نقشہ کھنچا گیا ہے۔ "قلعہ جنگی" میں افغان جنگ، دہشت گردی کے واقعات اور جنگ کے دوران ہونے والے واقعات کو قلعہ میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ قلعہ کے صحن میں لاشوں کے انبار، تہہ خانے میں پناہ لیے ہوئے قیدیوں کی بھوک پیاس نڈیال، بدن زخموں سے چور جنگ کی کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ ناول امریکا اور افغان جنگ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ناول "اے غزال شب"، "خس و خاشاک زمانے" "کاغذی گھاٹ" "مٹی آدم کھاتی ہے" "راجپوت" میں سیاسی و سماجی تاریخی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم کے واقعات، شہروں میں ہندوستان کی تقسیم مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگوں کا آپس میں اکٹھے رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا دشمن بن جانا، ہندوستان کی آزادی اور تقسیم سے جڑے خدشات سے لوگوں کی بے چینی وغیرہ کہیں براہ راست اور کہیں علامتی انداز میں ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے سیاسی سماجی اور تاریخی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

اکیسویں صدی میں جہاں موضوعات میں جدت پیدا کی گئی وہیں انہیں دوہرایا بھی گیا جبکہ ناول کی ہیت، تکنیک، اسلوب کے حوالے سے تبدیلیاں بھی نظر آتی ہے اور روایتی پیٹرن سے جڑے رہنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس صدی کے ناولوں کا پلاٹ سادہ اور پیچیدہ دونوں انداز اختیار کرتا ہے۔ نجمہ سہیل، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، نکہت حسن، یونس جاوید، عاصم بٹ کے ناول سادہ پلاٹ کے حامل ہیں جبکہ مرزا اطہر بیگ کے ہاں پیچیدہ انداز بیان

ہے ان کے ناولوں میں بیک وقت بہت سی کہانیاں گردش کرتی نظر آتی ہیں۔ مرزا اطہر بیگ کے ناول ہر لحاظ سے روایت سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے "قربت مرگ میں محبت" کے بعد "ڈاکیا اور جولاہا" "خس و خاشاک زمانے" "اے غزال شب" میں علامتی اور فلسفیانہ انداز اپنایا ہے۔ حسن منظر نے اپنے ناولوں میں فلسفیانہ گفتگو کو جگہ دی۔ خالدہ حسین نے فلسفے کی چاشنی سے معاشرے کے جبر پر قلم اٹھایا۔ حسن منظر کے ہاں مختلف زبانوں کی چاشنی ملتی ہے۔

اُردو کے علاوہ باقی زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ بھی فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی ہمیں اکیسویں صدی میں صرف اُن کے ہاں نظر آتی ہے۔ زیادہ ناول فلیش بیک تکنیک میں لکھے گئے جن میں راوی اپنے ماضی کی سیر کرواتا نظر آتا ہے۔ اس تکنیک کو سب سے زیادہ مستنصر حسین تارڑ نے استعمال کیا۔ جدید تکنیکی کو برتے ہوئے کہانی کو الجھاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ راویتی قاری کو ریاضت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے سمجھنے کے لیے قاری کو دماغ پر کافی زور دینا پڑتا ہے۔ یہ تکنیک مرزا اطہر بیگ کے ناولوں "غلام باغ" صفر سے ایک تک" پورے عروج کے ساتھ نظر آتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی "کا کئی چاند تھے سر آسمان" ہند اسلامی تہذیب کے پس منظر میں لکھا گیا ناول منفرد اسلوب، زبان تکنیک کو پیش کرتا ہے، مصنف نے ایک صنف ادب کا سہارا لے کر ہمیں پورے عہد کی سیر کروائی ہے۔ عصر حاضر میں لکھا گیا یہ ناول اپنے کرداروں کے عہد کی زبان اور الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ ہر ادیب اپنی انفرادی اور نجی زندگی کے تجربات، مشاہدات کو لفظوں کا سہارا دے کر تخلیق کرتا ہے۔ علامتوں اور موضوعات کو دہرائے جانے کے باوجود مجموعی طور پر اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والے ناول کو انسان کو درپیش مختلف النوع صورت حال، انسان کی نفسیاتی الجھنیں، ذہنی کشمکش، انسانی رویوں، اخلاقی اقدار سے دوری، مادیت پرستی، دیہی زندگی کی جہالت، جاگیرانہ طبقے کی عکاسی، تہذیبی و فکری تصادم، جنسی ہوس، فریب، سیاسی اور معاشی مسائل، انسان کی تنہائی اور اکیلے پن کا بیان، معاشرتی رجحانات کا پرچار وغیرہ موضوعات میں کافی جدت ہے۔ انسان کے پیچیدہ مسائل کی مختلف طریقوں سے عکاسی کی گئی ہے۔ تمام ناول اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عظمی طارق، قربت مرگ میں محبت: فکری و فنی، لاہور، شعبہ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۵۹

۲۔ انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ، لاہور؛ جمالیات، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۷

۳۔ غفور احمد، نئی صدی نئے ناول تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور؛ کتاب سرائے، ۲۰۱۴ء ص ۲۲۷

۴۔ ایضا، ص ۷۸

۵۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، لاہور؛ دستاویز، جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۵

۶۔ محمد حمید شاید، مٹی آدم کھاتی ہے، کراچی؛ اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵

۷۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، لاہور؛ دستاویز، جون ۲۰۱۲ء، ص ۶۵